© rasailojaraid.com

سفرنامہ پاکستان

پھر لاہور میں

(۱۱)

سعید احمد اکبرآبادی

لاہور ایرپورٹ پہونچا تو حسب توقع میاں اسلم، ریحانہ اور ان کے پھول سے چار دن بچے موجود تھے، نافع تو ابھی گود میں ہے صرف ہمکنا جانتا ہے۔ سب سے بڑا بچہ ظفر پہلے شریر تھا۔ اب سنجیدہ ہوگیا ہے۔ ان دونوں کے بیچ میں دو لڑکیاں ہیں۔ ایک کا نام زمیلہ ہے اور دوسری کا انجم، دونوں بچیوں کو نانا سے بڑی محبت ہے، مجھے دیکھتے ہی دوڑی ہوئی آئیں اور لپٹ گئیں۔ ان سب کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے اسٹیشن ویگن میں بیٹھکر گھر آیا، اور وہاں سامان رکھتے ہی پنجاب یونیورسٹی کی پرانی بلڈنگ میں آیا۔ یہاں دو دن سے آل پاکستان ہسٹری اینڈ کلچر ایسوسی ایشن کی بین الاقوامی کانفرنس ہو رہی تھی۔ میاں اسلم اس کے کرتا دھرتا تو تھے ہی، انھوں نے مجھکو بھی اس کا ایک مندوب بنوا دیا تھا۔ اور اسی حیثیت سے مندوب کا بیج اور دوسری متعلقہ چیزیں مجھے مل گئی تھیں۔ اس روا روی میں کانفرنس کے لئے میں مقالہ تو کیا لکھتا اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ کانفرنس میں شریک ہوکر بعض اچھے اچھے مقالات سن لئے اور ان پر جو مذاکرہ ہوا اس سے لطف اندوز ہوا۔ ،ور پاکستان کے تاریخ کے پروفیسروں اور اساتذہ کے علاوہ اپنے بعض دیرینہ دوستوں سے یکجا ملاقات بھی ہوگئی، شیخ عبدالرشید سابق پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)۔ لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عبدالمجید صاحب سالک مرحوم کے صاحبزادہ ڈاکٹر عبدالسلام۔ خورشید حبشی ایس۔ اے رحمٰن اور دوسرے احباب یہاں موجود تھے۔ ان سب سے ملاقات ہوئی۔

پروفیسر ہارڈی ان حضرات کے علاوہ باہر سے آنے والوں میں پروفیسر پیٹر ہارڈی (Peter Hardy) سے بھی ملاقات ہوئی۔ موصوف لندن یونیورسٹی میں ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ کے پروفیسر ہیں متعدد کتابیں لکھ چکے ہیں۔ میرے بڑے مخلص اور عزیز دوست ہیں۔ علی گڑھ آچکے ہیں، ۱۹۶۳ء میں جب میں لندن گیا تھا وہاں بھی ان سے خوب ملاقات رہی، اخلاقی حیثیت سے بھی بڑے شریف اور خوش مزاج انسان ہیں۔ اب اس وقت عصرانہ پر کئی برس کے بعد اچانک ملاقات ہوئی تو بہت خوش ہوئے دیر تک باتیں کرتے اور میرے حالات پوچھتے رہے۔ مستشرقین میں بہت سے لوگوں سے میری ملاقات ہے۔ لیکن ان جیسے مسکین طبع اور بے تکلف میں نے کم دیکھے۔

پروفیسر حمید الدین یہاں پروفیسر حمید الدین سے بھی ملاقات ہوئی۔ موصوف پنجاب یونیورسٹی لاہور سے تاریخ میں ایم۔ اے کرنے کے بعد سینٹ اسٹیفنس کالج، دہلی میں فارسی کے ایم۔ اے میں داخلہ، غالباً ۱۹۴۵ء میں لیا تھا۔ میں اس زمانہ میں کالج میں ہی تھا اور فارسی میں ایم۔ اے کلاس کا کلاسکل پوئٹری کا پرچہ میں ہی پڑھاتا تھا۔ چنانچہ حمید الدین کی ایک کلاس میرے ہاں ہوتی تھی ان کا ایک ساتھی وشوا متر عادل تھا۔ وشوا متر نے انگریزی میں ایم۔ اے کرلیا تھا اور اب دوسرا ایم۔ اے فارسی میں کر رہا تھا۔ یہ دونوں ایک ایک مضمون میں ایم۔ اے پہلے سے تھے اس لئے یونیورسٹی کے قانون کے مطابق دو برس کے بجائے ایک ہی برس میں ایم۔ اے کے امتحان میں شریک ہونے کی اجازت تھی۔ اس بنا پر یہ دونوں کالج میں ایک برس ہی رہے۔ امتحان میں شریک ہوئے اور اچھے ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔

وشوا متر عادل نہایت ذہین، خوش طبع اور خوش مزاج نوجوان اور اردو کا ترقی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پسند شاعر اور ادیب تھا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر بمبئی کی فلمی دنیا میں چلا گیا اور وہاں بڑا نام پیدا کیا۔ جب کبھی ملاقات ہوئی حسب معمول بڑی تپاک سے ملا۔ پندرہ سولہ برس ہوئے ایک دن بمبئی میں اچانک ملاقات ہوگئی تو بڑے اصرار سے ڈنر کی اور فلمی دنیا کی سیر کی دعوت دی۔ میں نے غالب کا یہ شعر پڑھا۔

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں؟

اور اپنی مصروفیت کا عذر کر دیا۔

حمید الدین بھی نہایت ذہین، طباع اور قابل تھے، تحقیق کا ذوق تھا، یہ آکسفورڈ یونیورسٹی چلے گئے، وہاں سے پی۔ایچ۔ڈی (تاریخ) کی ڈگری لی اس کے بعد انگلینڈ میں ہی ادھر اُدھر رہے۔ اب تیرہ چودہ برس سے امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی میں مستقل پروفیسر ہیں۔ اس وقت وہیں سے پاکستان کی کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ مجھ سے اس تعلق کے علاوہ میاں اسلم کے بھی بہت گہرے دوست ہیں۔ جب کبھی لاہور آتے ہیں ان کی بیوی اور بچوں کے لئے تحفے لاتے ہیں، تقسیم کے دو تین برس کے بعد ڈھاکہ جاتے ہوئے کلکتہ آئے تھے تو میرے پاس ہی قیام کیا تھا۔ بڑی محبت کے آدمی ہیں مجھکو ان سے ملکر ہمیشہ بڑی خوشی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی ہوئی۔ عصرانہ پہ اور بھی بہت سے پاکستانی دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ جن کے نام بھی یاد نہیں آرہے ہیں اس سے فارغ ہو کر میں نے وہیں عصر کی نماز ادا کی اور گھر آگیا۔

بستان فاطمہ میں ڈنر شب کو بوستان فاطمہ (سابق لارنس گارڈن) میں کانفرنس کا ڈنر تھا۔ میاں اسلم کے ساتھ اس میں شریک ہوا، آپ کو یاد ہوگا سیرت کانفرنس کے موقع پر اسی جگہ اہل لاہور کی طرف سے ایک نہایت شاندار عصرانہ ہوا تھا۔ اب یہ ڈنر تھا تو بجلی کے قمقموں سے ڈنرگاہ کو سجایا گیا تھا۔ پوری فضا نہایت سہانی اور دلکش تھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈنر بھی بہت شاندار تھا۔ یہاں کچھ اور حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں۔ جن میں ایڈوکیٹ بیرسٹر اور حکومت کے عہدہ دار شامل تھے۔

ایک لطیفہ یہاں ایک عجیب لطیفہ ہوا کہ میاں اسلم نے میرا ایک صاحب سے تعارف کرایا جن کا نام اب یاد نہیں یہ پنجاب کی مسلم لیگ کے ایک ذمہ دار عہدہ دار تھے اور پنجاب میں جب مسلم لیگ کی وزارت ۵۵ء میں بنی تھی۔ اس میں یہ وزیر بھی تھے۔ تعارف کے بعد ان کو مجھ سے کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہوگئی کہ مجھے الگ ایک صوفہ پر لیکر بیٹھ گئے اور ہندوستان کی سیاست پر گفتگو شروع کردی۔ میں نے کہا۔ ہندوستان میں آج کل ایمرجنسی کا دور دورہ ہے۔ لیکن جمہوریت اس ملک کے عوام میں اس درجہ رچی اور بسی ہوئی ہے کہ اس ایمرجنسی کو جلد یا بدیر لازمی طور پر ختم ہونا ہے۔ پریس پر چونکہ نہایت سخت قسم کا سنسر لگا ہوا ہے۔ اس لئے یہ تو نہیں بتایا جاسکتا کہ اندر ہی اندر کیا کچھ ہو رہا ہے۔ کتنے لوگ گرفتار کئے گئے ہیں۔ وہ کہاں کہاں رکھے گئے ہیں اور ان کے ساتھ جیل خانوں میں کس قسم کا سلوک ہو رہا ہے۔ اور یہ بھی نہیں معلوم کہ مخالف پارٹیوں کے کارکن جو جیل خانوں سے باہر ہیں وہ انڈر گراؤنڈ کچھ کام کر رہے ہیں یا بس دم سادھ کے بیٹھ گئے ہیں۔ البتہ ظاہر میں جو کچھ نظر آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایمرجنسی سے فوری طور پر کچھ فائدے ہوئے ہیں، مثلاً فرقہ وارانہ فسادات جو آئے دن ہوتے رہتے تھے وہ بند ہوگئے ہیں۔ اور اس بنا پر مسلمانوں کو اطمینان کا سانس لینے کا موقع ملا ہے۔ دفتروں میں کارکردگی کی رفتار بڑھی ہے یونیورسٹیوں میں جہاں روزمرہ ہنگامے ہوتے رہتے تھے۔ اب وہ سرد پڑ گئے ہیں۔ اور ان میں تعلیم بغیر کسی خرخشہ اور رخنہ کے ہو رہی ہے۔ لڑکے ریل گاڑیوں میں اور بسوں میں اور سڑکوں پر عورتوں اور لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے اب عقل کے ناخن لے لئے ہیں۔ اور اپنی حرکتوں سے باز آگئے ہیں، جرائم کی رفتار سست ہوگئی ہے۔ اسمگلنگ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرض شناسی کا احساس اور جذبہ ابھرا ہے ۔ بازار میں قیمتوں پر کنٹرول کر لیا گیا ہے شہر میں صفائی ستھرائی پہلے سے زیادہ نظر آتی ہے ۔ شہر کو خوبصورت بنانے کی مہم تیز ہو گئی ہے ۔

اب انھوں نے ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کے بارہ میں سوال کیا میں نے کہا ۔ میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان کے عوام اور گورنمنٹ دونوں کی دلی خواہش اور تمنا ہے کہ دونوں ہمسایہ ملکوں کے تعلقات بہتر سے بہتر اور دوستانہ ہوں ۔ اور پاکستان میں اتنے دنوں تک گھومنے پھرنے اور عوام وخواص سے ملاقات اور گفتگو کے بعد میرا احساس یہ ہے کہ یہی جذبہ اس ملک کے عوام اور گورنمنٹ کا ہے پھر چونکہ میں نفسیات کا طالب علم رہا ہوں اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ مسز اندرا گاندھی اور مسٹر بھٹو دونوں کا طریق فکر، طرز عمل اور امیال وعواطف ایک جیسے ہیں اس بنا پر امید ہے دونوں ملکوں کے باہمی تعلق کو خوشگوار بنانے کے لئے کوئی عملی اقدام جلد ہی کیا جائے گا اس میں دونوں کی عافیت ہے ۔ اور جنوب مشرقی ایشیا کا امن و اماں اس پر موقوف ہے

میری یہ تقریر ان صاحب کو بہت پسند آئی ، خوش ہو کر کہنے لگے آپ بڑے صاف ذہن اور کھلے دماغ کے انسان ہیں ۔ آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی ۔ اس کے بعد انہوں نے دوسرے دن کے ڈنر کی دعوت دی ۔ میں نے ہر چند معذرت کی مگر وہ نہ مانے ، آخر مجھے دعوت قبول کر لینی پڑی ۔ انہوں نے کہا میں کار لے کر آؤں گا اور آپ کو لے آؤں گا میں نے مروت میں دعوت قبول تو کر لی لیکن بوستان فاطمہ سے گھر آکر میں نے ذرا غور کیا تو محسوس ہوا کہ یہ دعوت نہ میرے حق میں اچھی ہوگی اور نہ میرے میزبان کے حق میں ۔ میرے حق میں تو اس لئے اچھی نہ ہوگی کہ میں پاکستان گورنمنٹ کی دعوت پر یہاں آیا تھا ۔ اس لئے اخلاقی طور پر میرے لئے مناسب نہیں ہے کہ گورنمنٹ کے کسی حزب مخالف کے لیڈر کے یہاں ڈنر کھاؤں ۔ جب کہ اس سے پہلے سے نہ میری دوستی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ جان پہچان، نہ صاحب سلامت اور نہ علیک سلیک، اس بنا پر ڈنر کی حیثیت سیاسی ہو جاتی، اب رہے میزبان! تو اون کے حق میں یہ دعوت اس لئے نامناسب تھی کہ وہ حزبِ مخالف کے لیڈر ہیں اور جس طرح ہر گورنمنٹ اپنے ہاں کی اپوزیشن پر الٹے سیدھے الزام لگاتی ہے پاکستان گورنمنٹ بھی اپنے حزب مخالف پر یہ الزام لگاتی ہے کہ یہ لوگ ہندوستان سے ساز باز کئے ہوئے ہیں اور اوس کے ایجنٹ ہیں۔ اس حالت میں اگر میں اون کے ہاں ڈنر کھاتا تو ممکن ہے اس سے مذکورہ بالا الزام کو قوت پہونچانے کی کوشش کی جاتی، بہرحال اس احساس سے مجھکو سخت پریشانی اور روحانی اذیت ہوئی۔ صبح ہوئی تو میں نے ارادہ کرلیا کہ اس دعوت کو منسوخ کرادوں گا۔ لیکن غالباً جو احساس مجھے پیدا ہوا وہ آنمحترم کو بھی ہوا۔ چنانچہ قبل اس کے کہ میں اپنا آدمی اون کے پاس بھیجوں اون کا آدمی آیا اور اس نے دعوت کی منسوخی کی اطلاع دی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ

جو تیری خوشی وہی میرا مدعا ہوا۔

مولانا عبدالصمد صارم

آج (۲۲ مارچ) صبح ہی ناشتہ سے فارغ ہوا ہی تھا کہ برادر عزیز مولانا عبدالصمد صارم مع اپنی اہلیہ کے آگئے اور مجھ سے بغلگیر ہوگئے۔ آنعزیز میرے ماموں زاد بھائی بھی ہیں اور شاگرد بھی ان کے والد ماجد قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاردی مرحوم کو میری والدہ صاحبہ مغفورہ رحمۃ اللہ علیہا سے بہت محبت اور گہرا تعلق تھا۔ اکثر آگرہ آتے رہتے تھے اور ہفتوں قیام کرتے تھے، مزاج نہایت لاابالی اور آزاد منش تھا۔ فارسی اور اردو زبان کے بڑے فاضل اور بلند پایہ شاعر تھے، تاریخ گوئی میں بڑا کمال تھا۔ نہایت ذہین اور طباع بجد صاف گو اور اپنی رائے میں مستبد تھے۔ شاعر ہونے کی وجہ سے نظام حیدرآباد کے دامالِ دولت سے وابستہ ہوکر حیدرآباد میں قیام کرلیا تھا تقسیم

© rasailojaraid.com

تک رہا اس زمانہ میں بیسیوں علمی، ادبی، تاریخی اور تنقیدی چھوٹی بڑی کتابیں لکھ ڈالیں۔ برادر عزیز میاں عبدالصمد صارم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوکر مدرسہ عالیہ فتحپوری کی مولوی فاضل کلاس میں داخل ہوئے اور اس طرح وہ میرے شاگرد بھی ہوگئے، پنجاب یونیورسٹی لاہور سے مولوی فاضل کرنے کے بعد مصر چلے گئے اور جامع ازہر میں داخل ہوئے۔ چند سال کے بعد لوٹے تو تقسیم سے پہلے ہی اورنٹیل کالج لاہور میں عربی کے استاد مقرر ہوگئے اور اب تک ہیں، اسی زمانہ میں انہوں نے طب کا امتحان پاس کرلیا۔ چنانچہ اب باقاعدہ مطب بھی کرتے ہیں۔ زود نویسی اور بسیار نویسی اپنے بزرگوار سے ورثہ میں ملی ہے۔ اب تک چھوٹی بڑی ہر قسم کی کتابیں، اصل اور ترجمہ دونوں کا ڈھیر لگا چکے ہیں اور اشہب قلم ہے کہ برابر رواں دواں ہے۔ کہیں ٹھہرنے اور سستانے کا نام ہی نہیں لیتا، ہر شخص کا مذاق الگ الگ ہوتا ہے۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ بازار کمال میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کتنا لکھا ہے، بلکہ یہ کہ کیسا لکھا ہے۔ جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ نے عمر بھر کی محنت ریاضت اور غور و فکر کے بعد صرف ایک ہی کتاب "تنقید عقل محض" لکھی مگر اس نے فلسفہ کا رخ موڑ دیا اور کانٹ زندہ جاوید ہوگیا۔ غالب کا چھوٹا سا اردو کا دیوان ناسخ کے ضخیم دیوانوں پر بھاری ہے۔ بہرحال یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ برادر عزیز نے اپنی جدوجہد محنت و مشقت اور دن رات کی مصروفیت سے لاہور کی ادبی اور علمی فضا میں اپنا ایک مقام بنا لیا ہے اور خوش حالی و اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جب تک میں لاہور میں رہا اُن سے اور اُن کے اہل خانہ سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

جناب عبداللہ قریشی تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ عبداللہ صاحب قریشی تشریف لائے۔ موصوف میاں اسلم کے روزانہ کی نشست و برخاست کے اور پرانے مخلص دوست ہیں۔ اردو زبان کے نامور ادیب اور صحافی ہیں، کئی کتابوں کے مصنف

© rasailojaraid.com

ہیں۔ ادبی دنیا اور دوسرے مجلات و رسائل سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ پنجاب اور خصوصاً لاہور کی گذشتہ پچاس برس کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی تاریخ کے حافظ ہیں، نہایت مخلص اور بے تکلف دوست ہیں۔ مجھے اون سے باتیں کہنے اور اون کی باتوں سے فائدہ اٹھانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ ان سے بھی جب تک لاہور میں رہا تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہوتی رہی۔

قرآن کانفرنس | دس بجے کے قریب ہسٹاریکل کانفرنس میں شرکت کے لئے میاں اسلم کے ساتھ یونیورسٹی گیا لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید اور دوسرے احباب بھی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ اُن کے ساتھ دو تین مقالات سنے۔ اتنے میں میاں اسلم نے کہا کہ برد میں قرآن کانفرنس ہو رہی ہے ان حضرات کی خواہش ہے کہ میں اس کانفرنس میں بھی تھوڑی دیر کے لئے شریک ہوں، میں نے کہا۔ بہت اچھا! اور خواجہ صاحب اور میاں اسلم کے ساتھ قرآن کانفرنس میں چلا گیا۔ یہ کانفرنس ایک بڑے ہال میں منعقد ہو رہی تھی۔ مجمع بہت بڑا تھا۔ اس کے صدر اس وقت لاہور کے مشہور فاضل اور مبلغ اسلام جناب ڈاکٹر اسرار احمد تھے، اور جناب مولانا ارشاد الحق صاحب تھانوی "حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی کی تفسیری خدمات" پر ایک وقیع اور طویل مقالہ پڑھ رہے تھے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ پورا مقالہ سنوں، لیکن میں جا کے بیٹھا ہی تھا کہ جناب صدر صاحب نے مقالہ کی خوانگی رکوا کر کانفرنس میں میری آمد اور اوس پر اپنی دلی مسرت کا اعلان کر دیا اور کانفرنس کی طرف سے مجھ سے تقریر کی فرمائش کی۔ کانفرنس میں مولانا محمد طاسین (کراچی) اور دوسرے جدید علماء بھی ڈائس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے لئے اب امتثال امر کے سوا چارہ ہی کیا تھا! کھڑا ہو گیا اور قرآن مجید سے ہی متعلق کم و بیش پون گھنٹہ تقریر کی، تقریر کے بعد چند سوالات کئے گئے اون کے جوابات عرض کئے۔

اورنٹیل کالج | تقریر کے بعد ہی حضرات علماء اور جناب صدر سے رخصت ہو کر کانفرنس سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باہر آگیا۔ قریب ہی اورنٹیل کالج تھا جو ۲۹-۱۹۲۸ء کے تعلیمی سال میں نو ماہ تک میرا قدیم آشیانہ رہا ہے، جی میں آیا کہ اسے بھی دیکھ لوں، خواجہ عبدالرشید صاحب کے ساتھ انہیں کی کار میں کالج آیا، اوس کے در و دیوار اور سادہ عمارت کو (جس میں گزشتہ پچاس برس میں ذرہ برابر بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے) دیکھکر اپنے یہاں قیام کا وہ زمانہ یاد آگیا۔ جب کہ برصغیر میں ہی نہیں، بلکہ اس سے باہر بھی اس کالج کی عظمت و شہرت کا ڈنکا بجتا تھا۔ مولوی محمد شفیع ایم۔ اے کینٹب (عربی) پروفیسر محمد اقبال (فارسی) حافظ محمود خاں شیرانی (اردو) اور مولانا نجم الدین۔ مولانا نور الحق، مولانا سید محمد طلحہ جیسے نامور اور بلند پایہ اساتذہ کی بیک وقت اس کالج میں موجودگی اور پھر اورنٹیل کالج میگزین ایسے اعلی درجہ کے تحقیقی سہ ماہی مجلہ نے علمی حلقوں میں کالج کی دھوم مچا رکھی تھی، کالج کے ہی پاس دلنر ہوسٹل ہے۔ اوس پر نگاہ پڑی تو اپنے اوس زمانہ کے نہایت بے تکلف دوست اور ساتھی مولوی نذیر احمد مرحوم، مسعود احمد، سید محمد ٹونکی، غلام غوث، محمد شریف اور صدیق احمد بیساختہ پرانی یادوں کے پردہ سیمیں پر

ابھر کر اپنی جھلک دکھا گئے

پروفیسر عبادت بریلوی میرے زمانہ میں کالج کے پرنسپل مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم تھے اب دس بارہ برس سے اس کے پرنسپل میرے دیرینہ عزیز دوست ڈاکٹر عبادت بریلوی ہیں۔ اورنٹیل کالج کی گذشتہ روایات کے مطابق موصوف پنجاب یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ بھی ہیں اور اورنٹیل کالج کے پرنسپل بھی۔ اردو زبان کے بلند پایہ ادیب اور نقاد ہیں۔ نقاد عام طور پر محقق نہیں ہوتے ان کی خصوصیت یہ ہے کہ محقق بھی اسی مرتبہ کے ہیں۔ چنانچہ لندن یونیورسٹی کے پنج سالہ مدت قیام میں انہوں نے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اردو کے جو مخطوطات محفوظ تھے۔ انہیں کھنگال ڈالا اور ان میں سے متعدد نادر اور اہم مخطوطات کو اڈٹ کرکے شائع کیا۔ اون کی زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے لئے وقف ہے فضول اور لغو باتوں میں وقت ضائع نہیں کرتے۔ اون کے اوقات منضبط ہیں۔ جن میں پابندی سے کام کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مقالات اور کتابوں کی شکل میں اتنا لکھا ہے کہ اون کے کسی معاصر نے شاید ہی لکھا ہو، ہر کام بڑے سلیقہ اور دل کی لگن کے ساتھ کرتے ہیں۔ غالب صدی تقریبات کے سلسلہ میں یونیورسٹی کا پورا منصوبہ انہیں کی نگرانی میں بڑی خوبی اور عمدگی سے پایہ تکمیل کو پہونچا۔ اور اب انہوں نے اورنٹیل کالج میگزین کے منتخب مضامین و مقالات (جن میں دو مقالے خاکسار راقم الحروف کے بھی ہیں) کئی جلدوں میں بڑے اہتمام و انتظام سے شائع کئے ہیں۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ ارباب علم و ذوق کو ان کا ممنون ہونا چاہئے۔ سنا ہے کہ مولوی محمد شفیع صاحب اور حافظ محمود خاں صاحب شیرانی کے مقالات کے مجموعے بھی شائع ہو گئے ہیں۔ لیکن وہ میری نظر سے نہیں گذرے، علمی اور ادبی کمالات کے علاوہ پروفیسر عبادت بریلوی بحیثیت انسان کے بھی بہت خوب آدمی ہیں، نہایت خوش اخلاق متواضع اور سنجیدہ و متین! وہ اون عیوب سے پاک ہیں جن میں اردو کے ادیب اور نقاد، چند خاص خاص لوگوں کو مستثنی کرکے عام طور مبتلا نظر آتے ہیں۔ میرا اون کا تعلق اوس زمانہ سے ہے جب کہ وہ تقسیم سے پہلے دلی کے اینگلو عربک کالج میں لکچرر تھے۔ اور میں سینٹ اسٹیفنس کا لیں تھا۔ پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد اون سے پہلی ملاقات ۱۹۶۳ء میں لندن میں ہوئی تو حسب معمول بڑی محبت سے پیش آئے۔ ایرپورٹ پر آئے۔ مکلف دعوتیں کھلائیں اور لندن یونیورسٹی کے متعدد پروفیسروں سے ملاقات کرائی لاہور میں جب تک رہا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہوتی رہی۔

ہم تینوں کالج میں پروفیسر عبادت بریلوی کے دفتر میں آکر بیٹھ گئے، یہاں چائے پی بات چیت کی آج کالج کی تعطیل تھی، مگر دفتر کھلا ہوا تھا۔ عبادت صاحب نے کہا۔ افسوس ہے۔ آج کالج بند ہے ورنہ میں آپ کی تقریر کراتا۔ اتنے میں ڈاکٹر وحید قریشی اور عبدالشکور صاحب احسن جو کالج میں استاد ہیں۔ آگئے اور ان سے بھی ملاقات ہوگئی جب ہم یہاں سے رخصت ہونے لگے تو عبادت صاحب بریلوی نے اپنی جدید تصنیفات جو آٹھ سے کم نہیں تھیں اور اورینٹل کالج میگزین کے منتخب مقالات کی متعدد جلدیں اور مدار الافاضل (قدیم فارسی لغت) جس کو ڈاکٹر محمد باقر سابق پروفیسر فارسی پنجاب یونیورسٹی نے آڈٹ کیا تھا اور ڈاکٹر نذیر احمد پروفیسر فارسی علی گڑھ یونیورسٹی نے اس پر محققانہ تنقید لکھی تھی۔ اس کی جلدیں بھی میرے نذر کیں۔

عبدالرحیم صاحب رجسٹرار یونیورسٹی | کالج سے ہم لوگ پھر یونیورسٹی آگئے جہاں ہسٹاریکل کانفرنس ہو رہی تھی یہاں عبدالرحیم صاحب سے ملاقات کرکے خوشی ہوئی۔ میں ۶۲ سنہ ۶۳ء میں جب مونٹریل (کناڈا) میں تھا تو رحیم صاحب بھی وہیں تھے۔ یہ اس زمانہ میں پنجاب یونیورسٹی لاہور میں لائبریرین تھے۔ چھ سات ماہ کے لئے اسی انسٹیٹوٹ میں جس سے میرا تعلق تھا اپنے ایک پروجیکٹ کے سلسلہ میں آئے ہوئے تھے۔ بڑے نیک اور قابل ہیں، ان سے وہاں روز ہی ملاقات ہوتی تھی۔ جمعہ کی نماز ہم لوگ انسٹیٹیوٹ کے ایک ہال میں پڑھتے تھے۔ اس میں یہ پابندی سے شریک ہوتے اور کبھی کبھی تقریر بھی کرتے تھے۔ ان کے بعض دوستانہ مشوروں سے وہاں کے زمانۂ قیام میں مجھے بہت فائدہ پہونچا۔ میرے بے تکلف اور مخلص دوست ہوگئے تھے۔ اب آج کل یونیورسٹی کے رجسٹرار ہیں۔

ڈاکٹر رانا احسان الٰہی | ڈاکٹر رانا احسان الٰہی سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان سے سیرت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کانفرنس کے دنوں میں روزانہ ہی ملاقات ہوتی تھی، یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے مدرس میں پہلے ریڈر تھے اب پروفیسر ہیں۔ مولانا عبدالعزیز میمن کے شاگرد ہیں۔ تحقیق کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ اُن کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ عربی ادب کے کسی اہم موضوع پر تھا (اب اس کا نام یاد نہیں رہا) میں نے اوس کے دیکھنے کی فرمائش کی تو وہ مقالہ مجھے دے گئے۔ میں نے اسے پڑھ کر دو دن کے بعد واپس کر دیا۔ بڑے خلیق، ملنسار اور متواضع دوست ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر معزالدین ڈائرکٹر اقبال اکاڈمی اور ڈاکٹر سعید شیخ ڈائرکٹر ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ دونوں سیرت کانفرنس کے دوستوں میں سے ہیں۔ لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید تو برابر ساتھ ہی رہے۔

پروفیسر شیخ عبدالرشید اس کانفرنس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ شیخ عبدالرشید صاحب سے ملاقات ہو گئی، ورنہ سخت افسوس رہتا۔ شیخ صاحب سے میرے تعلقات اوس زمانہ سے ہیں۔ جب کہ میں کلکتہ میں تھا۔ اور شیخ صاحب علی گڈھ میں تاریخ کے پروفیسر اور صدر شعبہ تھے، وہ کلکتہ آتے تو مع اہل خانہ میرے ہاں قیام کرتے تھے اور میری بچیاں امتحان دینے علی گڈھ جاتی تھیں تو شیخ صاحب کے یہاں ایک ایک مہینہ ٹھہرتی تھیں شیخ صاحب کا قیام علی گڈھ میں کم و بیش تیس برس رہا۔ یونیورسٹی میں اون کا بڑا مرتبہ اور وقار تھا۔ ہال کے پرووسٹ بھی رہے۔ ۵۹ء میں جب میں کلکتہ سے منتقل ہو کر علی گڈھ آیا یہ اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو گئے، شیخ صاحب یونیورسٹی کی سوسائٹی میں ایسے رچ بس گئے تھے اور اُن کو علی گڈھ سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ اون کا ارادہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی علی گڈھ میں رہنے کا تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہاں رشتہ داری بھی کرلی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے یہاں حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ اُن کو بددل اور بیزار ہو کر علی گڈھ کی سکونت ترک کرنی پڑی۔ اور وہ لاہور چلے گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کی وائس چانسلری کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زمانہ میں ہی اساتذۂ یونیورسٹی میں دو گروہ پیدا ہو گئے تھے ایک اسلام پسند اور دوسرا کمونسٹ جو اپنے آپ کو ترقی پسند کہتا اور اپنے حریف کو رجعت پسند کہتا تھا اس دوسرے طبقہ کے سربراہ ڈاکٹر عبدالعلیم (عربی) اور ڈاکٹر نورالحسن (تاریخ) تھے، اول الذکر طبقہ کے لیڈر پروفیسر عمرالدین مرحوم (فلسفہ) تھے۔ کمونسٹ یا ترقی پسند گروہ اقلیت میں تھا اور علمی اعتبار سے بھی کچھ زیادہ ممتاز یا نمایاں شہرت کا مالک نہیں تھا۔ اس کے بالمقابل اسلام پسند طبقہ اکثریت میں تھا اور اس میں یونیورسٹی کے ممتاز اساتذہ مثلاً پروفیسر ابرار مصطفیٰ (نباتات) پروفیسر شیخ عبدالرشید (تاریخ) پروفیسر عمر فاروق مرحوم (کیمسٹری) پروفیسر طاہر رضوی (جغرافیہ) پروفیسر شاہ مسعود عالم (جیالوجی) اور پروفیسر حفیظ الرحمٰن (قانون) اور ہندو پروفیسر گل (فزکس) وغیرہ شامل تھے، لیکن اس کے باوجود ترقی پسند طبقہ ذاتی تعلقات اور کچھ اپنی ڈپلومیسی کے باعث وائس چانسلر پر چھایا ہوا تھا۔ اور اس توسط سے یونیورسٹی کی اکزکٹو کونسل پر بھی اپنا رسوخ و اثر رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ جب اس گروہ کی دست درازیاں حد سے متجاوز ہو گئیں تو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بھی اسے برداشت نہ کر سکے، لیکن اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ اس لئے خود کچھ نہ کر سکے تو اپنے عہدہ کا ٹرم ختم ہونے سے پہلے ہی استعفا دیکر یہاں سے رخصت ہو گئے، اپنے استعفے کی یہ وجہ خود ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے بیان کی تھی جب کہ وہ بہار کے گورنر کی حیثیت سے ۵۸ء میں کلکتہ آئے اور مس نائیڈو گورنر کے ساتھ گورنمنٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

ذاکر صاحب کے بعد کرنل بشیر حسین زیدی وائس چانسلر ہوئے تو بعض خاص اسباب سے ان دو نوں گروہوں کی آویزش و کشمکش میں شدت پیدا ہو گئی اور اس کا نتیجہ ایک یہ بھی ہوا کہ جب پروفیسر شیخ عبدالرشید ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچے تو اگرچہ اپنی دیرینہ کارگذاریوں اور یونیورسٹی کی خدمات کے باعث یونیورسٹی کے قانون کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مطابق یہ تین برس کی توسیع کے مستحق تھے۔ لیکن ترقی پسند طبقہ نے دباؤ ڈال کر اکزیکٹو کونسل سے یہ رزولیوشن منظور کرالیا کہ شیخ صاحب کو توسیع نہ دی جائے، چنانچہ شیخ صاحب کو سبکدوش کر دیا گیا۔ اور اس کے بعد ہی ڈاکٹر نورالحسن پروفیسر اور صدر شعبہ تاریخ مقرر ہوگئے۔ شیخ صاحب پر طبعی طور پر اس واقعہ کا ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے علیگڈھ کو ہمیشہ کے لئے خیرآباد کہہ دینے کا فیصلہ کر لیا، شیخ صاحب نے یہ فیصلہ کس روحانی کرب و اضطراب سے کیا تھا؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب وہ علی گڈھ سے رخصت ہوئے ہیں تو اسٹیشن پر الوداع کہنے والوں میں میں بھی تھا۔ ہم سب نے دیکھا کہ شیخ صاحب کی آنکھیں پرنم ہیں، چہرہ بجھا بجھا ہوا ہے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ غیر معمولی صبر و ضبط سے کام لے رہے ہیں، ورنہ چیخیں مار مار کر رو پڑتے، حقیقت یہ ہے کہ اس نام نہاد ترقی پسند طبقہ نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کو سیکولر بنانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا اور جیسا کہ اخبارات کی رپورٹ کے مطابق سابق چیف جسٹس ہدایت اللہ نے ابھی پچھلے دنوں بمبئی میں جامعہ اردو علی گڈھ کے کنووکیشن کے خطبۂ صدارت میں بڑی صفائی سے کہا ہے ۱۹۶۵ء کے مسلم یونیورسٹی ایکٹ کی بلا اسی طبقہ کی کوششوں اور ریشہ دوانیوں کا شاخسانہ ہے جو مسلمانوں کے ہزار احتجاج کے باوجود اب تک یونیورسٹی پر مسلط ہے۔

شیخ صاحب کی عمر ۸۷-۸۸ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ کمزوری کا غلبہ ان کے چہرہ بشرہ اور رفتار و گفتار سے ظاہر ہوتا ہے، لیکن اب تک متحرک اور فعال ہیں۔ اس کانفرنس کے گل سرسبد ہی تھے۔ دونوں وقت شروع سے آخر تک کانفرنس میں شریک رہے۔ اور اس کی کارروائیوں میں سرگرم حصہ لیا۔ طبعاً نہایت شریف، خوش اخلاق، سیر چشم اور بڑے عالی حوصلہ انسان ہیں۔ ان سے مل کر ہمیشہ بڑی خوشی ہوتی ہے۔ وہ اب بھی ہم کو [illegible] یگانہ کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

© rasailojaraid.com